قرآن اور اتحاد

از تفسیر سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب طاب ثراہ

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(پ ۲ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۳)

''سب آدمی اصل میں ایک ہی دین والے تھے اسی لئے اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا ثواب وعذاب کی خبریں پہنچانے والا بنا کر اور ان کے ساتھ قانون بھیجا سچائی کے ساتھ تاکہ ان میں جو اختلاف پیدا ہوا ہو وہی قانون ان کے درمیان فیصلہ کن ہو اور اس قانون کے بارے میں اس کے بعد کہ کھلی ہوئی دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں انھوں ہی نے اختلاف کیا کہ جنھیں وہ دیا گیا تھا تو اللہ نے انھیں کہ جو ایمان لائے تھے اپنے حکم سے ان باتوں میں کہ جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے خصوصی رہ نمائی فرمائی اور اللہ جسے چاہتا ہے اس کی سیدھے راستے کی طرف خصوصی رہنمائی فرماتا ہے۔''

یہ آیت قرآن مجید کی مشکل آیتوں میں سے سمجھی گئی ہے جس سے بعض لوگوں نے اس توہم کی گنجائش پیدا کی کہ لوگوں کے درمیان شروع میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ انبیاء ومرسلین کے آنے سے اختلافات پیدا ہوئے تو ان اختلافات کی ذمہ داری خالق پر ہوئی۔ اسی لئے بعض لوگوں نے ضرورت محسوس کی کہ درمیان میں ایک جز کو مقدر ومحذوف مانیں اس طرح کہ سب ایک ہی دین پر تھے پھر ان میں اختلاف پیدا ہوئے اس وقت خدا نے انبیاء بھیجے۔ اب اختلافات کا پیدا ہونا انبیاء کے آنے سے قبل کی بات ہوگئی اور ذمہ داری خدا پر نہ رہی۔

ہمارے نزدیک امۃ واحدۃ کے فقرہ کا تعلق ان میں باہمی اختلاف ہونے نہ ہونے کے ساتھ ہے ہی نہیں بلکہ اس سے مقصود وہی ہے جسے دوسری جگہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کی لفظوں میں کہا گیا ہے یعنی تمام خلائق کے لئے دین حقیقی اللہ کی طرف سے ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ مختلف ادیان ومذاہب میں بٹ گئے ہیں تو یہ سب دین خدا کی طرف سے ہوں اور وہ ان کے اختلاف سے راضی ہو بلکہ اس کی طرف سے تو ان سب کا ایک ہی دین ہونا چاہئے اب اگر ان میں اختلاف ہے تو اس میں جو اس دین حقیقی کے مطابق ہے وہ حق ہے اور جو اس سے الگ ہے وہ باطل ہے۔ وہ وہی ایک راستہ ہے جسے سورۂ دہر میں تمام نوع انسانی کی طرف نسبت دے کر کہا گیا ہے کہ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ ''ہم نے اس کو ایک راستے کی طرف ہدایت کی'' اسی اتحاد دین کو اس آیت میں ''اُمَّةً وَّاحِدَةً'' کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ'' ''ان انبیاء کے ساتھ کتاب نازل کی''

اس میں عام طور سے کتاب کا مفہوم لکھے ہوئے مجموعہ کا لیا جاتا ہے اس لئے یہ دشواری محسوس ہوئی ہے کہ انبیاء میں سے ہر ایک کے ساتھ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ صاحب کتاب انبیاء تو معدودے چند ہی ہیں۔ زیادہ تر انبیاء سابق کی نازل شدہ کتاب کے پیرو اور اس کے مبلغ ہوتے تھے۔ اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ ھُم کی ضمیر جو معھم میں ہے کل مجموعی کے طور پر ہے کہ اس سلسلۂ انبیاء کے ساتھ کتاب اتاری گئی نہ کل افرادی کے طور پر جس کے معنی یہ ہوں کہ ہر ایک کے ساتھ کتاب اتری۔

ہمارا ذوق یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں اَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکُتُبَ جمع کے صیغہ کے ساتھ ہونا چاہئے تھا کیونکہ سب کے ساتھ ایک ہی کتاب تو نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ متعدد کتابیں متعدد انبیاء پر نازل ہوئیں۔

اس مفرد کتاب کی لفظ سے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ لکھا ہوا مجموعہ مراد ہی نہیں ہے جسے ہماری عرف عام میں کتاب کہتے ہیں بلکہ یہ کتاب کُتب سے ہے جس کے معنی فرض کے ہیں جس کے اعتبار سے کہا گیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا اور اس طرح کتاب کے معنی اس آیت میں قانون الٰہی کے ہیں۔ بعض دوسرے آیاتِ قرآن میں بھی ایسے شواہد ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کا استعمال متعدد جگہ قرآن مجید میں قانون کے معنی میں ہوا ہے اور اس آیت میں بھی یہی معنی مراد ہیں جیسا کہ میں نے ترجمہ کیا ہے کہ ''ان کے ساتھ قانون بھیجا'' اور قانونِ الٰہی درحقیقت سب انبیاء کے ساتھ والا ایک ہی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعض اور دفعات میں باختلاف حالاتِ ظرف زمان و مکان کچھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہوں۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

(پ ۴ سورۂ آل عمران آیت: ۱۰۲)

''اے ایمان والو! اللہ کے غضب سے بچو، جو حق ہے بچنے کا اور دنیا سے نہ اٹھو مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔''

''جو حق ہے بچنے کا.....'' اس کی تشریح امام جعفر صادقؑ نے اس طرح فرمائی ہے کہ: **یطاع و لا یعصی و یذکر فلا ینسی و یشکر فلا یکفر (صافی)**: اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد رکھا جائے، فراموش نہ کیا جائے اور اس کا شکر کیا جائے، ناشکرا پن نہ کیا جائے۔

دنیا سے اٹھنا، نہ اٹھنا تو ظاہر ہے، انسان کے اختیار میں نہیں ہے لیکن یہ ایک عام محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم دین اسلام سے کسی وقت بھی منحرف نہ ہونا کہ جب بھی دنیا سے اٹھو، دین حق پر قائم و برقرار ہونے ہی کی حالت میں اٹھو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۔

(پ ۴ سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۳)

''اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو اور تتر بتر نہ ہو اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے جب کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی تو اس کے

فضل وکرم سے تم بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کی بالکل نگر پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے چھٹکارا دیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے لئے ظاہر کرتا ہے، شاید کہ تم سیدھے راستے پر لگ جاؤ۔''

''اللہ کی رسّی کو تھامنے'' کے معنی ہیں سب کا اس نظام پر قائم رہنا جو اللہ کا قائم کردہ ہے۔ اسی نظام کا نام ''دین'' ہے اور اسی نظام کا دستور العمل قرآن ہے اور اسی نظام کے رہبر اور عملی نمونے رسولؐ اور امامؑ ہیں۔ اس طرح احادیث میں جو حَبلِ اللہ کی تفسیر ''دین اسلام'' سے ہوئی ہے اور کتاب الٰہی سے ہوئی ہے اور آل محمدؐ یا خصوصیت کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ ہوئی ہے، ان سب کا ماحصل ایک ہی قرار پاتا ہے۔

حدیث ثقلین کے بعض طرق میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ:

ایّھا الناس انی قد ترکت فیکم جبلین ان اخذتم بھما لن تضلّوا بعدی۔ میں تم میں دو رسّیاں چھوڑتا ہوں اگر تم انھیں تھامے رہوگے تو کبھی میرے بعد گمراہ نہیں ہوگے۔

اس سے حَبلِ اللہ کے اس جامع مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(پ ۴ سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۴)

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے جو بھلائی کی دعوت دیتی ہو، نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہو اور بری باتوں سے منع کرتی ہو اور یہی وہ ہیں جو ہر طرح کی بھلائی حاصل کرنے والے ہیں۔''

''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت وہدایت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض عین نہیں ہے بلکہ واجب کفائی کی حیثیت رکھتا ہے کہ کچھ لوگ جب اس کام کو انجام دے دیں تو باقی لوگوں پر فرض نہ رہے گا۔ پھر یہ کہ جامعۂ اسلامی کی ہر فرد اس کی اہل بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ بہت سے وہ ہیں جو ضروری مسائل سے خود ہی ناواقف ہیں۔ وہ دوسروں کی ہدایت کیوں کر کریں گے؟ اس لئے ہمیشہ اس کی انجام دہی کرنے والے مجموع امت کے کچھ ہی افراد ہوں گے، سب نہیں چنانچہ کافی میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا تمام اُمّت پر واجب ہے؟ حضرت نے فرمایا 'نہیں' پوچھا کیوں؟ آپ نے فرمایا:

انما ھو علی القویّ المطاع العالم بالمعروف من المنکر لا علی الضعفۃ الذین لا یھتدون سبیلا الٰی ایّ من ایّ یقول الی الحقّ من الباطل۔ ارے! یہ فریضہ تو اس پر عائد ہوسکتا ہے جو اتنی قوت رکھتا ہو، جس کی بات کا وزن لوگ مانیں، جو اچھائی اور برائی کے امتیاز سے واقف ہو، نہ وہ بے چارے جنھیں خود پتہ نہیں کہ وہ کدھر سے کدھر جارہے ہیں یعنی انھیں احساس نہ ہو کہ وہ خود حق سے باطل کی طرف قدم بڑھارہے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے اسی آیت قرآن سے استشہاد فرمایا اور پھر دوسری آیت پیش فرمائی کہ:

ومن قوم موسیٰ امّۃ یھدون بالحقّ وبہ یعدلون موسیٰ

کے پوری قوم میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کا راستہ دکھاتی ہے اور اسی کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کرتی ہے۔

اس کے بعد ظاہر ہے کہ بدرجۂ اتم ان کاموں کو جو دعوت الی الحق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ہیں، انجام دینے والے وہی ہو سکتے ہیں جن کی نظر کبھی بھلائی اور برائی کے امتیاز میں چوکے نہیں اور وہ معصومینؑ کے ذوات مقدسہ ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض روایات میں ہے کہ امۃ کی تفسیر تنزیلی ایمّۃ ہے یعنی تم میں ایسے اماموں کو ہمیشہ ہونا چاہئے اس صورت میں یہ ''چاہئے'' حکم تکلیفی نہ ہوگا بلکہ ضرورت عقلی کا اظہار ہوگا کہ تمہارے لئے مناسب و اصلح ہے کہ ایسے امام موجود ہوں لہٰذا خداوندعالم ان کے وجود کا ذمہ دار ہے۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَاجَآئَھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔

(پ ۴ سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۵)

''اور ان لوگوں کے ایسے نہ ہونا جو تفرقہ میں پڑ گئے اور کھلی ہوئی دلیلوں کے آنے کے بعد اختلافات میں مبتلا ہو گئے اور یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

آیت جن الفاظ میں مسلمانوں کو انتباہ کر رہی ہے، وہ صاف پتہ دیتے ہیں کہ یہ خطرہ سامنے آنے والا ہے کہ جیسے یہود و نصاریٰ کھلے ہوئے دلائل کے بعد تفرقہ میں پڑ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے اسی طرح یہ امت بھی اختلافات میں مبتلا ہو جائے۔

نیز یہ بھی اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جس چیز میں ان کا اختلاف ہوگا وہ ایسی نہیں ہے کہ اس میں خالق کی طرف سے کوئی ہدایت نہ ہوئی ہو بلکہ اس بارے میں ''نص'' موجود ہوتے ہوئے یہ لوگ اختلافات میں مبتلا ہوں گے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

من بعد ما جآئھم البیّنٰت: کھلی ہوئی دلیلوں کے آنے کے بعد۔

اب جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہم مسلمانوں کے اختلافات کا نقطۂ مرکزی تلاش کرتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ''زعامتِ کبریٰ'' یعنی جانشینی رسول کا مسئلہ ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ہوا اور آج تک قائم ہے۔

قرآن مجید صاف کہہ رہا ہے کہ یہ اختلاف ''کھلے ہوئے دلائل'' کے آنے کے بعد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جماعت ان دلائل کا اقرار کرے اور نص کو متّبع سمجھے وہ صراط مستقیم پر ہے اور جو ان نصوص کا انکار کرتے ہوں، وہ اس تفرقہ اور اختلاف کے ذمہ دار ہیں اور ان کے لئے قرآن میں خالق کی طرف سے سخت الفاظ میں وعید ہوا ہے کہ:

اولٰٓئک لھم عذاب عظیم: ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔

(پ ۱۰ سورۂ انفال، آیت: ۴۶)

''اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کہ تم میں سستی پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی اور صبر و برداشت سے کام لو، یقینا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْکَ فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰہُ ھُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (پ ۱۰ سورۂ انفال، آیت: ۶۳-۶۲)

''اور اگر وہ چاہیں گے کہ آپ کو دھوکا دیں تو بلا شبہ آپ کے واسطے اللہ کافی ہے، وہ وہ ہے جس نے آپ کو تقویت پہنچائی اپنی امداد سے اور ایمان والوں کی جماعت سے اور ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی۔ اگر آپ تمام روئے زمین کی دولت صرف کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا نہیں کر سکتے تھے مگر اللہ نے ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی، یقیناً وہ زبردست ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

اصل مدد کرنے والا تو خداوندعالم ہے مگر ظاہری ذریعہ امداد کا ایمان والوں کی جماعت ہے تو اس کا بھی خالق نے اپنی امداد کے ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

اس مثال کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ کسی ولی الٰہی، کسی مقرب بارگاہ خداوندی اور خصوصیت کے ساتھ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام یا دیگر آل طاہرین کو وقت مصیبت طلب امداد کے لئے پکارنے پر جو ایک جماعت ''شرک'' ''شرک'' کی آواز بلند کرتی ہے، وہ کتنا غلط ہے۔

خالق نے مومنین سے رسولؐ کی مدد کرائی تو وہ اسے پیغمبر کے لئے ''سہارے'' کے طور پر ''بالمومنین'' کہہ کے ذکر فرما رہا ہے، اب وہی ان بزرگواروں سے ہماری مدد کرادے تو اس میں شرک کا کیا سوال ہے؟!

ہاں پکارنے والے کے ذہن میں یہ ہونا چاہئے کہ اصل مدد کرنے والا خداوندعالم ہے اور یہ حضرات اس کی طرف سے مقرر شدہ ذرائع ہیں اور بس۔ اس میں شرک کا کوئی تصور قائم کرنا بالکل غلط ہے۔

یہ الفت باہمی جسے خالق نے قدرت الٰہی کا کرشمہ کہا ہے، انصار کی جماعت سے تعلق رکھتی ہے جن میں پہلے اوس وخزرج کے دو جتّھے ہمیشہ برسرپیکار رہے تھے مگر اسلام نے انھیں گلے ملا دیا اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد تاریخ میں اوس وخزرج کی قبیلہ واری جنگ پھر کبھی وقوع میں نہیں آئی مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ اس کے بعد خود مہاجرین میں ''حب دنیا'' پھوٹ ڈلوا دے اور پھر ''مؤلفۃ القلوب'' کی جماعت کا ایک تیسرا عنصر بھی ایسا داخل ہوجائے جس سے بعد میں مسلمانوں کے درمیان وہ خونریز لڑائیاں برپا ہوجائیں جن کی لپیٹ میں مہاجرین وانصار سب ہی آجائیں اور جن کی ہنگامہ خیزی کی شدت کے سامنے اوس وخزرج کی پرانی لڑائیاں بھی گردِ کارواں بن کر پیچھے رہ جائیں اور جن کے نتائج آج تک مختلف خطہ ہائے ارض میں مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہے ہوں۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۔ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ۔
(پ ۱۷، سورۂ انبیاء، آیت: ۹۳-۹۲)

''بے شک یہ تمہاری ملت ہے، ایک ملت، اور میں تمہارا پروردگار ہوں، تو میری عبادت کرو اور ان سب نے اپنے معاملات کو جدا جدا کر رکھا ہے (بہرحال) سب ہماری ہی طرف پلٹنے والے ہیں۔''

''امت'' جس کا ترجمہ ہم نے ''ملّت'' کے ساتھ کیا ہے، اس کے معنی بعض مفسرین نے دین کے لئے ہیں۔ اس

طرح اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صحیح دین خلق خدا کا ایک ہے اور افتراق و اختلاف بعد والوں کی ذہنی جدّت طرازیوں سے پیدا ہوا ہے جنھیں اصطلاح قرآنی میں اھوآء کہا جاتا ہے اور جو معیار حق نہیں ہو سکتے، (لو اتبع الحق اھوآئھم لفسدت السمٰوت والارض)

علامہ طبرسیؒ نے قدیم مفسرین کے حوالہ سے اس کی یہ تفسیر پیش کرتے ہوئے اس کی تشریح بہت خوب فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

انّ ھٰذا دینکم دین واحد عن ابن عباس و مجاھد والحسن واصل الامّۃ الجماعۃ الّتی علیٰ مقصد واحد فجعلت الشریعۃ امۃ واحدۃ لاجتماعھم بھا علیٰ مقصد واحد۔ (مجمع البیان)

یعنی تمہارا دین ایک اکیلا دین ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس، مجاہد اور حسن سے منقول ہے اور اصل میں امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کا ہدف نگاہ ایک ہو تو قانون الٰہی ایک امت اس معنی میں ہے کہ اس سے پوری جماعت ایک ہدفِ نگاہ پر متفق ہو جاتی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔

(پ ۲۶ سورۂ حجرات، آیت: ۱۳)

''اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں قرار دیا ہے اس کے لئے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو، یقینا تم میں عزت والا زیادہ اللہ کے یہاں وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہو، بلاشبہہ اللہ بڑا جاننے والا ہے، خبر رکھنے والا۔''

یہی وہ غلط وجوہِ امتیاز کے مقابلے میں مساواتِ اسلامی اور غلط تصوّر مساوات کے مقابلے میں معیارِ امتیاز کو ثابت کرنے والی آیت ہے جس نے تمام دنیا کی تہذیبوں کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کو بلند ترین درجہ بخشا ہے۔ اس کے تحت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روز فتح مکہ برملا یہ اعلان فرمایا کہ:

یا ایّھا النّاس انّ اللّٰہ قد اذھب عنکم بالاسلام نخوۃ الجاھلیۃ و تفاخرھا بأبائھا انّ العربیۃ لیست باب و والدۃ وانّما ھو لسان ناطق فمن تکلّم بہ فھو عربیّ الا انّکم من اٰدم واٰدم من تراب واکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم۔ (علی بن ابراہیم)

اے انسانو! اللہ نے اسلام کے ذریعہ سے تمہاری جاہلیت اور گھمنڈ اور اجداد کی طرف نسبت کی بنا پر جو فخر کیا جاتا تھا، وہ ختم کر دیا ہے۔ آگاہ ہونا چاہئے کہ عرب ہونا باپ اور ماں کے لحاظ سے نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک وصف کے لحاظ سے ہوتا ہے جو گویائی ہے تو جس میں یہ وصف ہے، وہ عرب ہے۔ آگاہ ہو کہ تم سب آدم کی اولاد ہو آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ تم میں عزت اس کی زیادہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

درمیان میں جو فقرات ہیں، وہ عرب کے اس تصور فوقیت کے خلاف انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے تو اس کے خلاف روشنی ڈالی گئی ہے کہ گویائی کا وصف نسلی طور پر کسی قوم کی ملکیت سمجھنا غلط ہے۔ اصل و نسل کے لحاظ سے جسے تم عرب نہیں سمجھتے، وہ بھی اس وصف کا حامل ہو سکتا ہے لیکن آخر میں جو معیار امتیاز ہے، اس

کو واضح کیا گیا ہے کہ اس میں عرب اور غیر عرب کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو کردار کا ایک سانچا ہے جسے ''تقویٰ'' کہتے ہیں، وہ خود کسی کام کا نام نہیں ہے بلکہ اس سانچے میں ڈھلے ہوئے جو کام ہوتے ہیں، وہ وہی ہوتے ہیں جو مرضی خدا کے مطابق اور ہر حال میں جو انسان کا فرض ہے، اس کے موافق ہوتے ہیں۔

دنیا میں جو غلط اقدار امتیاز تھے اور اب بھی ایک طبقے میں ہیں جیسے رنگ کے لحاظ سے تفریق کے گورے اونچے ہیں، کالے نیچے اور نسل کے لحاظ سے امتیاز، ان تفرقوں کو اسلام نے مٹایا ہے، اس اعتبار سے اسے ''دین مساوات'' کہنا صحیح ہے مگر اپنی طرف سے اس نے اوصاف شخصی کے لحاظ سے امتیازات قائم کئے ہیں جن میں سب سے بڑا معیار امتیاز یہی تقویٰ ہے جس کے تحت میں جو افعال ہوتے ہیں، وہ ''اعمال صالحہ'' کہلاتے ہیں۔ اس میں جو بلند درجہ رکھتا ہے، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے اونچا ہے۔

چونکہ دنیا نے دراصل ان امتیازات کو بھلا دیا تھا، اس بنا پر اس نے اپنی طرف سے غلط اقدار امتیاز کے قرار دے لئے تھے لہٰذا قرآن نے مساوات پر اتنا زور نہیں دیا ہے جتنا ان امتیازات کو نظرانداز کرنے والوں کے خلاف عدم مساوات پر زور دیا ہے اور طرح طرح سے مثالیں دے دے کر سمجھایا ہے کہ دیکھو یہ دونوں برابر نہیں ہیں، مثلاً اندھیرا اور اُجالا یکساں نہیں، زندہ اور مردہ برابر نہیں، سایہ اور دھوپ برابر نہیں، میٹھے اور کھاری دریا برابر نہیں وغیرہ وغیرہ نہیں تو تم انسانوں میں کیوں ان امتیازات کو نظرانداز کرتے ہو کہ مومن اور کافر یکساں نہیں۔ خوش اعمال اور بداعمال یکساں نہیں، عالم اور جاہل یکساں نہیں، ہدایت یافتہ اور گمراہ یکساں نہیں اور اس سب کے آخر میں نتیجے کے لحاظ سے نجات یافتہ اور غیر نجات یافتہ یکساں نہیں ہیں جسے قرآن مجید نے یوں کہا ہے کہ: **لا یستوی اصحٰب النّار و اصحاب الجنّة اصحاب الجنّة هم الفائزون** (یعنی) ''دوزخ والے اور بہشت والے یکساں نہیں ہیں، بہشت والے ہی وہ ہیں جو نتیجۃً کامیاب ہیں۔''

❁❁❁